ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

ISSN 2321-4627

نومبر 2018ء

-/15 روپے

عظیم مجاہد آزادی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین:			
مولانا ابوالکلام کی تاریخی بصیرت	:	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	7
مولانا آزاد کا جامع مسجد دہلی میں خطاب اور اس کی عصری معنویت	:	ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی	13
مولانا آزاد کا اسلوبِ طنز طنزیاتِ آزاد کے حوالے سے	:	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	18
مولانا ابوالکلام آزاد فن خطوط کے آئینہ میں	:	ڈاکٹر ضامن علی حسرت	24
''یوسف علیہ السلام'' مولانا آزاد کی فراموش کردہ کتاب	:	ظہیر دانش عمری	29
مولانا آزاد کی فکر و سیاسی بصیرت	:	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	33
مولانا ابوالکلام آزاد اور علوم جدیدہ	:	ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی	37
''خطباتِ آزاد'' میں خواتین کا تذکرہ	:	ڈاکٹر جان نثار معین	42
''مولانا ابوالکلام آزاد ملت اسلامیہ کی ایک عظیم المرتبت شخصیت	:	حلیم بابرؔ	52
مولانا آزاد کی تقاریر میں مساوات و یکجہتی کا درس	:	محمد ارشد مبین زبیری	55
''مولانا ابوالکلام آزاد'' ایک ہمہ جہت شخصیت	:	خیر النساء علیم	59
مسلمانوں میں سیاسی شعور: الہلال کا کردار	:	انور ہادی	64
تحریکِ آزادی کے دو جانباز سپاہی۔ آزاد و جوہر	:	ڈاکٹر شیخ فاروق باشاہ	68
مولانا آزاد کی تعلیمی فکر اور اس کی افادیت	:	محسن خان	74
مولانا آزاد کی تین اہم تصانیف	:	ناز آفرین	78

oOo

ڈاکٹر شیخ فاروق باشاہ
لکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج
رائے چوٹی، ضلع کڈپہ (آندھرا پردیش)

تحریکِ آزادی کے دو جانباز سپاہی۔ آزاد و جوہر

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا رول نہایت واضح اور دوٹوک رہا ہے۔ مسلمان اپنے رہنماؤں کی رہبری میں ہندوستانی اقلیتی طبقے ہونے کے باوجود اکثریتی طبقہ سے کہیں بڑھ کر جان و مال کی قربانی پیش کی۔ مسلمانوں میں قومیت، وطنیت اور جذبہء حریت پیدا کرنے میں جن اہم قائدین کا رول رہا ہے ان میں سرفہرست امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور رئیس الاحرار مولانا محمد جوہر ہیں۔

خدا نے ان دونوں قائدین کو بے شمار صلاحیتوں اور لیاقتوں سے نوازا تھا۔ تقریر ہو یا تحریر، صحافت ہو یا سیاست، قیادت ہو یا امامت، نظم ہو یا نثر، ہر میدان کے وہ ماہر تھے، سب سے بڑھ کر دونوں جذبہء ایمانی سے سرشار تھے۔ کبھی انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ اور نہ دشمنوں کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث وہ چاہتے تو انگریزی حکومت میں بڑے سے بڑا عہدہ پا سکتے تھے۔ اور ان کی زندگی شاہانہ گزر سکتی تھی لیکن انہوں نے فقیری اور اسیری کی زندگی کو محبوب جانا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں حالات شدید انتشار سے دوچار تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے ہر قدم پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں صحافت کی پر خار وادی میں قدم رکھنا اپنے لیے موت کو دعوت دینا تھا۔ محمد علی جوہر آزاد سے دس سال بڑے تھے۔ چنانچہ ان کو صحافت کے میدان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ قوم و ملک کی خدمت کے لیے انہوں نے کامریڈ کے نام سے ۱۴۔ جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستانیوں کے دل جیت ہی لیے لیکن اہل زبان انگریز بھی مولانا کے اسلوب پر فریفتہ ہو گئے اور بے چینی سے اخبار کی راہ تکتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ''الہلال'' اخبار جاری کیا۔ جس کے عزائم جتنے بلند تھے زبان و اسلوب بھی اتنا ہی دلکش اور پر تاثیر تھا۔ مولانا آزاد بھی صحافت کے ذریعے قوم ملت کی خدمت اور اہل ہند میں جذبۂ حریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الہلال میں لکھتے ہیں۔ ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان کے لیے آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول

نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''

(ایوان اردو، دہلی دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸)

جس طرح مولانا محمد علی کی انگریزی نے ساری دنیا میں دھوم مچادی اسی طرح مولانا آزاد کی نثر نے حیات آفرین کا درجہ پایا۔ مولانا آزاد کی اردو نثر کے تقابل میں مولانا محمد علی تو کیا کوئی بھی اہل قلم دور دور تک ان کا ہم سایہ نظر نہیں آتا ہے۔

''الہلال اور ہمدرد'' نے اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔ قوم دوستی، حب الوطنی، سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کیے۔ باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کیا۔ اہل ہند کے دلوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی دونوں اخباروں نے کھل کر ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھایا۔ محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں اتحاد کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان جاری کیا۔

''اس وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد ہے' میں توقع کرتا ہوں کہ لیڈران چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظرانداز کردیں گے۔ اور وقت کا جو کچھ تقاضہ ہے اس کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں گے''۔

(ہمدرد ۲۴۔ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۵)

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے میں تحریک خلافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے تاسیس گزاروں میں مولانا محمود الحسن اور مولانا عبدالباری ہیں لیکن اس تحریک کو عام کرنے اور بلاتفریق مذہب وملت سارے ہندوستانیوں کو اس میں شمولیت کے لیے فضا تیار کرنے میں جہاں بہت سے علماء کا رول رہا ہے وہیں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ خلافت تحریک کو اس وقت اور بھی استحکام ملا جب اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگئے۔ بالآخر یہی تحریک تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ علی برادران اور تحریک خلافت ایک جاں دو قالب ہوگئے۔ یہ اشعار زبان زد خاص و عام تھے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کو صحافت اور خطابت کی بدولت کئی بار جیل جانا پڑا، قصور صرف یہ تھا کہ دونوں صحافت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہے تھے اور مکمل آزادی کا مطالبہ کررہے تھے۔ مولانا آزاد اپنی زندگی کے ۹ سال ۷ مہینے زندان فرنگ میں رہے اور محمد علی تقریباً ۷ سال قید فرنگ میں رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے قید کی زندگی کو ہنسی خوشی قبول کرلیا۔

مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں

''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ

نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''

(ایوان اردو، دہلی دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸)

جس طرح مولانا محمد علی کی انگریزی نے ساری دنیا میں دھوم مچادی اسی طرح مولانا آزاد کی نثر نے حیات آفرین کا درجہ پایا۔ مولانا آزاد کی اردو نثر کے تقابل میں مولانا محمد علی تو کیا کوئی بھی اہل قلم دور دور تک ان کا ہم سایہ نظر نہیں آتا ہے۔

''الہلال اور ہمدرد'' نے اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔ قوم دوستی، حب الوطنی، سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کیے۔ باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کیا۔ اہل ہند کے دلوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی دونوں اخباروں نے کھل کر ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھایا۔ محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں اتحاد کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان جاری کیا۔

''اس وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد ہے' میں توقع کرتا ہوں کہ لیڈران چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کر دیں گے۔ اور وقت کا جو کچھ تقاضہ ہے اس کو پورا کرنے کے لیے تیار رہوں گے''۔

(ہمدرد ۲۴۔ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۵)

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے میں تحریک خلافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے تاسیس گزاروں میں مولانا محمود الحسن اور مولانا عبدالباری ہیں لیکن اس تحریک کو عام کرنے اور بلاتفریق مذہب و ملت سارے ہندوستانیوں کو اس میں شمولیت کے لیے فضا تیار کرنے میں جہاں بہت سے علماء کا رول رہا ہے وہیں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ خلافت تحریک کو اس وقت اور بھی استحکام ملا جب اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگئے۔ بالآخر یہی تحریک تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ علی برادران اور تحریک خلافت ایک جاں دو قالب ہوگئے۔

یہ اشعار زبان زد خاص و عام تھے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کو صحافت اور خطابت کی بدولت کئی بار جیل جانا پڑا، قصور صرف یہ تھا کہ دونوں صحافت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہے تھے اور مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مولانا آزاد اپنی زندگی کے ۹ سال ۷ مہینے زندان فرنگ میں رہے اور محمد علی تقریباً ۷ سال قید فرنگ میں رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے قید کی زندگی کو ہنسی خوشی قبول کر لیا۔

مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں:

''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ

سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟۔

(ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۲)

مولانا محمد علی اپنی اسیری کے ایام کو خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہیں:

فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

آزاد و جوہر خوددار طبیعت کے مالک تھے۔قوم کے مفاد کی خاطر انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو قربان کردیا۔دوران اسیری مولانا آزاد نے اپنی رفیق حیات کی شدید علالت ،رحلت اور آخری رسومات میں شرکت کے لیے درخواست دینے کوقوم کے مفاد کے مغائر اور اپنے لیے باعث ہزیمت سمجھا۔اپنی وفاشعار بیوی کی ہمیشہ کی جدائی کو گوارا کرلیا لیکن حکام وقت کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا۔بالکل اسی طرح مولانا محمد علی بھی بیجاپور جیل میں محروس تھے، بیٹی آمنہ شدید ترین مرض دق میں مبتلا تھیں اور اسی مرض میں وہ بھی اس دنیا سے رحلت کرگئیں۔بیٹی کی وفات والد کے دل پر کیا قیامت ڈھائی ہوگی لیکن مولانا نے غم جدائی کو برداشت کرلیا۔صبر وشکر اور تسلیم و رضا کا پیکر بنے رہے۔اور کیا ہی خوب کہا:

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کے مابین کئی چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔صحافت، سیاست اور خطابت کی صلاحیتیں دونوں کے رگ و پے میں سرایت کرگئی تھیں۔راسخ العقیدہ مذہبی پیروکار ہونے کے ساتھ حب الوطنی ،قوم دوستی اور ملت کی خیرخواہی کے جذبات سے سرشار تھے۔صاحب طرز ادیب، بلند پایہ نثر نگار اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ایک کو شاعری میں تفوق ہے تو دوسرے کو نثر میں تقدم۔

مولانا آزاد اور جوہر کی نثر کا تقابل کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کے یہاں مولانا آزاد جیسا حُسن ، دلکش اسلوب اور زور بیان نہیں لیکن خلوص، درد، تاثیر، عام فہمی اور سلاست اور دل نشینی میں یقیناً ان کی نثر کسی طرح سے پیچھے نہیں ہے۔

سید حامد مولانا آزاد اور مولانا جوہر کی نثر کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابوالکلام کی بلند پروازی کے مقابلے میں جوہر کے یہاں پیادہ روی ہے۔ وہاں ادب عالیہ اوراختراعات فائقہ، یہاں صرف یہ جاں سوز فکر کہ ایک قوم کی قوم کو، ایک جاہل پس ماندہ قوم کو اپنا مفہوم کس طرح ذہن نشین کرایا جائے ،لیکن محمد علی کا انگریزی پر اہل زبان کا سا عبور وہ اضافی وصف ہے جو ابوالکلام کو میسر نہ تھا۔علاوہ بریں محمد علی کی نثر (اُردو) زبان اور محاورہ کی اُن غلطیوں سے محفوظ ہے جو رُخِ زیبا پر تل کی طرح ابوالکلام کے یہاں مل جاتی ہے''۔

(نظر برنی،مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات نئی دہلی،ص ۱۹۲)

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد جنگ آزادی میں دونوں ہم سفر تھے۔حصول آزادی میں دونوں کا ساتھ

تقریباً ۱۵ سال رہا۔ دونوں میں بہت ساری مماثلتیں اور مشابہتیں پائی جاتی ہے۔ دونوں بے باک اور اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ دونوں شاعر اور نثر نگار۔ دونوں سچے اور پکے مسلمان اور مذہبی عبادات کے پابند تھے۔ ۱۵ سال کے عرصہ میں صحافت، سیاست اور ملکی و مسلکی مسائل کے تیئں دونوں کے درمیان رفاقت اور رقابت رہی۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے اور اختلافات رائے کا اظہار بھی برملا کرتے تھے۔ مولانا آزاد کا اسلوب اشارے اور کنایے کی زبان میں ہوتا، لیکن مولانا محمد علی کا اظہار برملا جوشیلے انداز میں ہوتا، اور انداز تخاطب بالکل راست ہوتا۔ دونوں میں رقابت کی وجہ ذاتی رائے نہیں بلکہ قوم و ملت کی فلاح و بہبودی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد بعض مسائل میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں مولانا محمد علی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''مسٹر محمد علی سے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں، ایسے قریب کہ عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اچھی طرح اندازہ کرلیا کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش، دونوں چیزیں موجود ہیں''۔

(ضیاءالحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

''یہی مسٹر محمد علی ہیں جو اِن تمام تعلیمات و ہدایات عالیہ کے مرکز جمود (علی گڑھ کالج) کے تعلیم یافتہ اور ایک ایسی ریاست کے عہدہ دار تھے۔ چند مضامین اور ایک رسالہ لکھ کر اُنہوں نے اپنی قابلیت ضرور منوائی تھی۔ لیکن کوئی بھی ان کی موجودہ حیثیت ملی سے واقف نہ تھا لیکن جب زمانے نے مہلت دی اور قوتوں کو چمکنے کے اسباب میسر آئے تو آج کوئی نہیں جو ان کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر و بحث کا معترف نہ ہو''۔

(ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی جوہر گرچہ کہ عمر میں مولانا آزاد سے بڑے تھے پھر بھی وہ انہیں اپنا استاد مانتے تھے، لیکن جب ان دو عظیم شخصیتوں کے درمیان اختلاف ہوا تو ہر ایک نے کھل کر اس کا اظہار کیا۔ لیکن وہی شائستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں، کہیں اُنھوں نے ذاتیات کو موضوع بحث بننے نہیں دیا۔ دونوں کی تحریریں پُر وقار، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مولانا آزاد کا الہلال جب منظر عام پر آیا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔ چنانچہ اول روز ہی سے اس تحریک سے متعلق لکھنا شروع کردیا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا آزاد نے ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر مولانا محمد علی سے چند اُمور کی وضاحت چاہی تھی۔ الہلال کی اس اشاعت میں مولانا آزاد کے اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط بھی چھپی تھی جس کا عنوان تھا

''نشہ شام کی نصف شب''۔

مولانا آزاد ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک مرحوم کے زمانے میں اپنے کالج سے نئے نئے خطابات حاصل کئے تھے اور پھر یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی زر پرستی کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی دائمی حکمرانی کے مسئلے کو بار بار چھیڑا۔ وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب چاہا تھا کہ آذر کے بتکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ مسٹر محمد علی بھی علی گڑھ سے اس لئے اُٹھائے گئے ہیں تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں......

یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہوا گر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کے مندرجہ ذیل اُمور پر اپنی معلومات ظاہر کر دیں۔ وہ ابتداء سے شریکِ کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءِ ظن سے نجات دے سکتے ہیں''۔

(ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا محمد علی کب خاموش رہنے والے تھے۔

الہلال کے دونوں مضامین کا جواب دیتے ہوئے اپنا ایک مکتوب شائع کرایا جس کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں:

''مانا کہ الہلال افقِ عالم پر اس وقت نمودار نہ ہوا تھا مگر آزادی کے بدر کامل کو یہ کیسا گہن لگا تھا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمتِ علی گڑھ پر نور ایمان غالب آیا ہے''۔

''آنجناب نے صرف سر ہار کورٹ بٹلر کی ۹ راگست ۱۹۱۲ء کی تحریر کا ترجمہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں پڑھا اور اس میں جو فقرہ ۳۱ رجولائی ۱۹۱۱ء سے ماخوذ تھا اس کی غلط تاویل فرما کر بلا غور و فکر اور بے تامل پچاس ساٹھ مسلمانوں کو کاذب اور فریبی ٹھہرا دیا اور (آگے آیت) کلام الٰہی سے اپنے فتوے کی تصدیق بھی حسب معمول فرما دی، شاید ظن مومن کی یہی تعریف ہو۔ مگر یہ مسائل مذہبی ہیں اور میں محض سگِ دنیا، البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ طریقۂ اخبار نویسی خواہ لکھنے والے کے لئے کتنا ہی دل خوش کن اور عوام کے لئے کیسا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، جن پر سب وشتم کی بوچھار پڑتی ہے ان کے لئے ضرور بہت کچھ دل شکن ہے''۔

(ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا آزاد نے بھی جوابی وار کیا، لکھتے ہیں:

''آپ نے ''آزادی کا بدرِ کامل'' اگر محض ''ہلال'' کے لئے لکھا ہے تو اس زورِ عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں، لیکن اگر طنزاً ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجئے کہ آزادی اور آزاد بیانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوسکتیں۔ میرے دل میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس دعوے کا خطرہ نہیں گذرا مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دنیا سے معدوم نہیں ہوسکتی۔ اس کو مجھ

میں نہ ڈھونڈیے۔ البتہ اس کی آواز اُٹھے تو کانوں کو بند بھی نہ کیجیے۔

منکر نتواں گشت اگر دم زغم از عشق
ایں نشہ بمن گر نبود بادِ گرے ہست

(ایضاً ۱۰۳،۱۰۴)

محمد علی جو ہر بھی وار کرنے سے کب چوکتے، اس کا بھی جواب دیا۔ لیکن وہی شائستہ اور شگفتہ انداز میں:

''آپ متعجب ہیں کہ ''ظن المومنین خیرا'' کی کیا یہی تعریف ہے کہ کمیٹی کو ایسے سخت الزام دیئے جائیں؟ لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ آخر حسن ظن کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہیے۔ برسوں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لیا لیکن اس حسن ظن کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے دل میں اور میری زبان پر ہے۔ اب تو کچھ دنوں سوء ظن ہی سے کام لینے دیجیے۔ آپ نے ''سگِ دنیا'' کے لقب کی ٹوپی خود ہی اپنے سر اوڑھ لی۔ حالانکہ جن سروں کے لئے قطع کی گئی تھی ان کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں' گو آپ اس طرف اشارہ نہ کریں۔ حیران ہو کہ آپ کو کسی خیال میں اپنے سے مختلف نہیں پاتا، لیکن پھر دیکھتا ہوں تو بہت دور ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جام تو آپ کے ہاتھ میں بھی ہے مگر ''فسق'' کے الزام کے لئے میرا ہی وجود موزوں ہے:

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق'' (۱۰۴)

اس کے بعد مولانا آزاد نے فروری اور مارچ ۱۹۱۳ کی الہلال کی اشاعتوں میں ''حدیث الغاشیہ'' کے عنوان سے اور ''نشۂ نیم شبی کا صبح خمار'' کے تحت عنوان کے تحت مولانا محمد علی کے انقلابِ حال پر پھبتیاں کسی ہیں۔

گرچہ کہ وہ بادہ وساغر کی زبان میں ہیں کہیں کہیں صاف نام بھی لیا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی اس کا جواب دیا۔ وہی طرز اپنایا جو مولانا آزاد نے اختیار کیا تھا۔ لیکن دونوں کا انداز بیان شائستہ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا محمد علی نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کو اپنا مذہبی استاد تسلیم کیا ہے۔ مولانا کی ذہانت اور ذکاوت کی خوب تعریف کرتے ہیں اور ان کو ایک اچھے مقرر بھی مانتے ہیں۔ ایک جگہ ہمدرد میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام سے میری رقابت کی حقیقت یہ ہے کہ میں ہر جگہ اس کی شہادت دینے کو تیار ہوں کہ مولانا کی ذکاوت و ذہانت مجھ سے کہیں زیادہ ہے''۔

(ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۰۵)

اِن دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے پر جو اعتراض کئے ہیں اس میں کہیں بھی ذاتیات کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔ صرف قوم و ملک کا مفاد عزیز تھا۔ اختلافی نظریات کے پیچھے کبھی بھی اپنی انا کو دخیل ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں مولانا جوہر آزادیٔ کامل کا مطالبہ کرتے ہوئے دیارِ غیر میں اپنی جان قربان کر دی اور مولانا آزاد تقسیم کا تلخ گھونٹ پی کر بھی ہندوستان ہی میں اپنی ناقابل فراموش خدمات سے مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے وقار اور تمکنت کا باعث بنے۔ اور سیاست، صحافت اور ادب میں ایسے نقوش چھوڑے کہ آنے والی نسل ہمیشہ اس سے مستفیض ہوتی رہے گی۔

○○○